سائیں کے ڈیرے سے گزری تو اسے وہ بلا جو چھوٹی دیوار پر کھڑے ہوکر اپنی دم جھلاتے ہوئے گندی نظروں سے رضیہ کو دیکھا کرتا تھا، آج کچھ زیادہ برا نہیں لگا۔

اپنے مامے کے آگے وہی بھلے کا کٹورہ رکھتے ہوئے رضیہ نے کہا "ماما! بابا اب وہاں نہیں ہے۔ ایک اور ہی گٹھا سا آدمی وہاں ریڑھی لگائے کھڑا ہے۔ کہہ رہا تھا اس نے بابے سے وہ اڈا خرید لیا ہے۔"

مامے غفور نے کہا "اس کے بھلے اچھے ہیں رضیہ، تو بھی چکھ کے دیکھ۔"

رضیہ کو بڑا دکھ ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ ایک اچھے بھلے نوجوان کو گٹھا بنا دیا جس کا رنگ پیلیا سفید تھا اور جس کے بھلے مامے کو بابے کے بھلوں سے بھی اچھے لگے تھے۔

دوسرے دن وہ اپنی ماں سے پوچھ کر داتا دربار سلام کرنے گئی تو جاتے ہوئے صدیق سے اس کا نام پوچھ کر درگاہ میں داخل ہوئی اور واپسی پر اس کے لیے نیاز کے چھ سات مکھانے لے کر آئی۔

دربار کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دو مکھانے منہ میں ڈالے تو اسے خیال آیا کہ کتنا اچھا ہو اگر وہ یہ نیاز صدیق کو دے کر گھر جائے۔ لیکن دو مکھانے منہ میں ڈالنے کے بعد اس کی مٹھی میں کل پانچ مکھانے رہ گئے تھے، اور پانچ مکھانے کسی کو دیتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے اس نے دونوں مکھانے منہ سے نکال کر اور اپنی اوڑھنی سے پونچھ کر واپس مٹھی میں بینچ لیے اور جاتے جاتے ساری نیاز صدیق کو دے گئی۔

صدیق نے سارے مکھانے ایک ایک کر کے چوس لیے اور بہت خوش ہوا کہ اس علاقے میں ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو اتنی جلدی واقف بن جاتی ہیں۔ رات کو صدیق کی ماں نے صدیق سے اس کے نئے اڈے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ بس "ہاں ماں" اور ناں ماں" کر کے ہی رہ گیا۔

کوئی آدھی رات کے وقت صدیق کی آنکھ کھلی تو اس کے سینے میں اس بلا کی ہوک اٹھی کہ وہ اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے رضیہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو سب کچھ گڈمڈ گیا اور وہ خالی ہاتھ ہو

کر بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک وہ اس بات پر پچھتاتا رہا کہ اس نے کیوں وہ اڈا لیا اور کس لیے وہاں ریڑھی لگائی اور کس کارن اس لڑکی سے نیاز لے کر کھائی۔

رضیہ نے سچی سچی ساری بات کریم دفتری کی بیٹی زبیدہ کو بتلا دی کہ داتا دربار کے باہر منٹ کیمرہ فوٹو گرافر کے ساتھ جو نوجوان دہی بھلے بیچتا ہے، اس نے رضیہ کا آرام سکون لوٹ لیا ہے اور اب وہ بھاٹی رہنا نہیں چاہتی، اس آدمی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے — لیکن جب زبیدہ نے اس آدمی کے گھر کا پتہ پوچھا تو رضیہ نے کہا "مجھے کیا معلوم، میں کوئی اسے جانتی تھوڑا ہوں۔"

اگلے دن جب زبیدہ اور رضیہ دونوں صدیق کی ریڑھی سے بھلے لینے گئیں تو زبیدہ نے ایک زور کا دوہتڑ رضیہ کی کمر میں مار کر کہا "نی در فٹے منہ تیرا! منہ نہ متھا، کس کے لیے اپنا محلہ چھوڑ رہی ہے۔"

صدیق سمجھ تو گیا لیکن اس نے کوئی بشارت نہ دی۔ بھلے کٹورے میں ڈال کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے پیسے لینے سے منع کر دیا اور دونوں لڑکیاں ایک دوسری کو پہلوؤں کے کولہے مارتی واپس چل پڑیں۔

دس پندرہ قدم جا کر رضیہ رکی اور کٹورہ زبیدہ کے ہاتھ میں دے کر بولی "تو چل، میں ابھی آتی ہوں۔" زبیدہ کٹورہ اس کے ہاتھ سے لے کر چلی نہیں، وہیں کھڑی ہو گئی۔

کھمبے کی مدھم روشنی میں زبیدہ نے دیکھا کہ رضیہ صدیق کے پاس جا کر رکی، ہنس کر اسے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ صدیق نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اپنے ماتھے سے لگائیں اور دیر تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ سامنے بانس کے صوفے بنانے والے نے اپنی دکان بند کرتے ہوئے پجاری کو آرتی اتارتے دیکھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ شام کے دھوئیں میں، گرد میں ایک کے دو ہونے کو سمجھ کر آگے نکل گیا۔

رات جب رضیہ ضرورت سے زیادہ کھانسی تو اس کی مامی نے آواز دے کر پوچھا "کیا بات ہے رضیہ، اس قدر زیادہ کیوں کھانس رہی ہے؟" تو رضیہ نے کان میں گھچا گھچ انگلی چلا کر کہا "کچھ نہیں مامی، کھرکھری لگ گئی ہے۔"

نیند میں ڈوبے تھکے ہارے ماے غفور نے کہا "مصری کی روڑی منہ میں رکھ لے، ٹھیک ہو جائے گی۔"

"رکھی ہوئی ہے ماما جی" رضیہ نے اونچی آواز میں جواب دیا، حالانکہ وہ جھوٹ کہہ رہی تھی۔۔۔ اس کے منہ میں صرف صدیق کا نام تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

رضیہ کے سینے میں اچانک ایسی خارش ہونے لگتی تھی کہ اس سے پہلے اس کو اس قسم کا جلون کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

وہ حیرانی سے اپنے کندھوں، اپنے سینے اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور اس کی بے چینی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں گال آنسوؤں سے بھیگ چکے ہیں اور جلد میں مرچیں سی لگنے لگی ہیں۔ اس نے اپنے دوپٹے سے منہ رگڑ کر صاف کیا اور چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے سامنے کی چھوٹی دیوار پھلانگ کر صدیق اندر آیا اور چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر سیدھا اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

بڑی دیر تک وہ اس کے دونوں ٹخنے پکڑ کر زمین پر بیٹھا رہا اور سر جھکا کر روتا رہا۔ رضیہ نے اس پاگیری پر کوئی مزاحمت نہ کی اور چپ چاپ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے اور خواب میں اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا اس لیے وہ سر جھکائے اور پوری آنکھیں کھولے ان ہاتھوں کو دیکھتی رہی جنہوں نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔

سرمئی رنگ کے اس گرے خواب میں ڈوبی وہ بڑی دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی اور صبح صادق کے وقت وہ خواب اپنی تعبیر بن کر سامنے آ گیا۔

دونوں اپنی اپنی جگہ سے ایک ساتھ اٹھے اور اپنے اپنے صحن کا دروازہ کھول کر آہستگی کے ساتھ باہر نکل گئے۔ دور دور بجھتی ہوئی روشنیوں کے نیچے کوئی کوئی تانگہ سٹیشن کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کو بھی ایک خالی تانگہ مل گیا اور وہ دونوں اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر سٹیشن پہنچ گئے۔ پشاور سے آنے والی لیٹ گاڑی اب چلنے کے قریب تھی اور انجن کی دھمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا پڑاؤ ساہیوال تھا۔

رضیہ اور صدیق ساہیوال پہنچ گئے اور یہاں صدیق نے دہی بھلے کی ریڑھی

لگانی شروع کر دی۔ ان دونوں کو بس ایک ہی شوق تھا..... دن بھر بھلے بوندی بنانے کا، شام کو ریڑھی لگانے اور برتن اجالنے کا اور رات کو ایک دوسرے میں گھس کر سونے کا!

عجیب ہے کہ دونوں ایک ہی سانچے میں ڈھلے تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کی گردن پر منہ رکھ کر سونے کی عادت تھی۔ رات کو سوتے میں وہ چھوٹے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے ضد کرتے ہوئے اپنا اپنا چہرہ دوسرے کی گردن پر رکھنے کے لیے جھگڑا کرتے تھے اور منمناتے رہتے تھے۔ گو اس جھگڑے میں زیادہ تر رضیہ ہی کامیاب ہوتی لیکن صدیق بھی نیند میں "میں نہیں" "میں نہیں" کہتا ہوا دو تین باریاں لے لیتا تھا۔

ان کی دہی بھلوں کی دکانداری کچھ ایسی شدت سے چلنے لگی تھی کہ اب ان سے دن میں اتنا مال نہیں بنتا تھا جتنی کہ اس کی مانگ تھی۔ پیسے بھی جمع ہونے لگے تھے اور رضیہ کو ساہیوال بھی پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ پانچ مرلے کی چھوٹی سی زمین خرید کر ہمیشہ کے لیے یہاں آباد ہو جائے اور اس کی آگے کی نسل اسی شہر سے چلے۔

جب ایس ایچ او صاحب کے یہاں شام کو باقاعدگی سے دہی بھلوں کی بڑی پلیٹ جانے لگی تو صدیق نے یہ شہر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ رضیہ کو اپنی آئندہ نسل کی چھتر چھاؤں والا شہر چھوڑنا کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔ اس نے تھانے دار صاحب کے لیے پلیٹ تیار کرنے کا سارا ذمہ اپنے سر لے لیا اور صدیق کو اس الجھن سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔

لیکن ایک روز جب تھانے سے تین بڑی پلیٹیں بھجوانے کا حکم آیا تو صدیق بپھر گیا۔ اس نے سپاہی کے سامنے کچھ احمقانہ جملے کہہ دیے تو ہیڈ کانسٹیبل نے صدیق کے پاس آ کر ایک ہاتھ تو اس کے کندھے پر رکھا اور دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر بولا "تھانے دار صاحب نے تمہارا نکاح نامہ منگوایا ہے۔ اصل دینا ہے تو اصل دے دے، فوٹو کاپی جمع کرانی ہے تو وہ کرا دے۔" صدیق نے ہیڈ کانسٹیبل کا ہاتھ جھٹک کر کہا "گھر پڑا ہے۔ ابھی لے کر آتا ہوں اور تیرے صاحب کو بھجواتا ہوں۔ مہربانی!"

ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا تو صدیق نے گھر آ کر رضیہ کو اٹھایا۔ بیسن میں لتھڑے اس

کے ہاتھ دھلوائے اور کھلا گھر اور کھلے برتن چھوڑ کر اسے ساتھ لے کر شاہدرے اپنے دوست جمیل کے پاس آ گیا جس نے اپنی برادری کے لوگوں میں بھدی سی ڈھولک بجوا کر رضیہ اور صدیق کا نکاح پڑھوایا تھا۔

جمیل کے گھر سے اپنا نکاح نامہ لے کر اور اس کی پانچ فوٹو سٹیٹ کاپیاں بنوا کر وہ سیدھا مانسہرہ پہنچ گیا۔ لیکن یہ شہر رضیہ اور صدیق دونوں کو پسند نہ آیا اور تین دن ادھر ادھر کی کھلیں بھرنے کے بعد وہ منگورہ پہنچ گئے۔

منگورہ کا بازار بڑا پررونق اور گاہکوں سے بھرا بھرا تھا۔ یہاں تکے کباب اور کڑاہی گوشت کی بہت سی دکانیں تھیں جہاں اعلیٰ درجے کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے اور دنبے لٹکا کرتے تھے اور مقامی لوگوں سے زیادہ باہر کے آئے ہوئے ٹورسٹ مشام انگیز باربی کیو سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

صدیق نے کڑاہی گوشت کی سب سے بڑی دکان کے پہلو میں دہی بھلوں کا چھابہ لگا لیا کہ یہاں فوری طور پر ریڑھی حاصل کرنا ذرا مشکل تھا۔

باہر سے آئے ہوئے ٹورسٹوں کے مقابلے میں مقامی لوگوں نے صدیق کے دہی بھلوں پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی تو انہیں دن میں تین مرتبہ بھلے تیار کرنا پڑتے۔ رضیہ دن بھر تیل کڑکا کر سوکھے بھلے تلتی رہتی اور صدیق اڈہ چھوڑ کر وقفے وقفے سے سٹاک لے جایا کرتا۔ یہاں کا دہی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا مگر صدیق نے دہی، دودھ، سوکھا پاؤڈر اور نشاستہ ملا کر ایک ایسا ملغوبہ تیار کر لیا تھا کہ بہت سے مقامی گاہک بھلا نکال کر باہر پھینک دیتے تھے اور چمچوں سے دہی کھا جاتے تھے۔

رضیہ یہاں بہت خوش تھی کہ آتے ہی دو یوسف زئی لڑکیاں اس کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ان دونوں لڑکیوں نے آٹھویں تک اردو کی وہی کتابیں پڑھی تھیں جو رضیہ بھائی کے سکول میں خود بھی پڑھ چکی تھی۔ اتفاق سے دونوں لڑکیوں کے نام بھی ایسے تھے جن کو رضیہ پشتو فلموں میں اچھی طرح سن جان چکی تھی۔ زرینہ عمر میں رضیہ سے بڑی تھی لیکن پشمینہ رضیہ کی ہم عمر تھی۔ پشمینہ کا چہرہ اعلیٰ درجے کے صحت مند ریڈ بلڈ مالٹے جیسا تھا اور اس کی ٹھوڑی کے عین نیچے ننھا سا بھنور تھا جو موسمبی کے پیندے میں ہوتا ہے۔ زرینہ اور پشمینہ رضیہ کے کام میں اس کا ہاتھ بھی بٹاتیں اور اسے

روزمرہ استعمال کی چیزوں کے پشتو ناموں سے بھی آگاہ کرتی جاتیں۔

کوئی دو ماہ بعد جب صدیق نے منگورہ سے مادیان جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو رضیہ نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ زرینہ اور پشمینہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ صدیق بے بس ہوگیا اور اسے دنیا میں پہلی مرتبہ رضیہ نامی لڑکی کچھ بری سی لگی۔

بات زرینہ، پشمینہ کی نہیں تھی اور بات رضیہ کی بھی نہیں تھی۔ اصل میں بات کچھ اور ہی تھی.... وہ جو ایک دوسرے کی گردنوں پر چمچے چڑھا چڑھا کر سونے کی عادت تھی، اس میں کمی واقع ہونے لگی تھی۔ دو دفعہ ایسے بھی ہوا کہ کچھ کام کی زیادتی سے اور کچھ صدیق کے دیر سے آنے کی وجہ سے رضیہ بستر پر لیٹ کر سو گئی تو صدیق اس کے قریب پرانے تخت پوش پر کمر سیدھی کرتے کرتے بے ہوش سو گیا اور صبح دونوں جاگے تو دونوں نے کچھ اور ہی سمجھا۔

صدیق کا خیال تھا کہ زرینہ، پشمینہ کے ساتھ بہلا ہو جانے سے اور تیز رفتار کمائی کی بدولت سونے کے دو کنگن بن جانے سے رضیہ اس سے بے نیاز ہوگئی ہے جبکہ رضیہ کو پکا یقین ہوگیا تھا کہ وزیر آبادی انگریز کی لڑکی کے بار بار اڈے پر آنے سے اور دن میں تین تین مرتبہ دہی بھلے کھانے سے صدیق کی وفاداری تبدیل ہو رہی تھی.... لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ دونوں میں مرد عورت والی ساری خوبیاں موجود تھیں اور دونوں نسل انسانی کو آگے بڑھانے پر پوری طرح سے قادر تھے مگر ان کے درمیان چاہت کے وہ رشتے نہیں رہے تھے جو پہلے ہی روز رضیہ کے دل میں اور دوسرے ہی دن صدیق کے دل میں پیدا ہو کر ان کا سینہ چھلنی کر چکے تھے اور وہ ایک دوسرے کی گرم سانسوں اور شیر گرم بدنوں کے محتاج ہو گئے تھے۔

لیکن آپ تفصیلوں میں جا کر گیا کریں گے اور اس سارے واقعہ کا کھرا کس طرح سے دبا سکیں گے کہ آپ کے پاس وہ علم ہی نہیں جس کی وجہ سے صدیق اور رضیہ میں ایسا شدید نقصان پیدا ہوا جسے کوئی نام دینا مشکل ہے۔

ایک روز صدیق رضیہ کو سوتا چھوڑ کر مادیان چلا گیا اور اس نے وہاں ایک ہوٹل سے رابطہ کر کے ہوٹل کے لیے دہی بھلے بنانے شروع کر دیے۔

اس ہوٹل کے ریستوران میں گاہکوں کو سیٹ ملنا مشکل ہوگئی۔ رضیہ سے اس نے رابطہ توڑا نہیں۔ ہر دوسرے دن آتا رہا اور اس کو ڈھیر سارے پیسے اور خشک میوے دے کر چلا جاتا رہا۔ اس کی اس آنریبل قسم کی بے وفائی سے رضیہ کے دل میں بھی بے وفائی کا جذبہ عود کر آیا اور اس نے کھلے بندوں زرینہ، اور پشینہ کے تربوروں سے ملنا شروع کر دیا۔ ایک روز وہ زرینہ، پشینہ گل زمان، اور حسن خان کے ساتھ لاری میں بیٹھ کر مادیان آ گئی۔ سب نے مل کر صدیق کے ہوٹل میں کھانا کھایا، اس سے گپ بازی کی اور شام کو واپس منگورہ چلے گئے۔

صدیق کو رضیہ کا یہ رویہ تھوڑا سا برا لگا لیکن زیادہ نہیں۔ وہ اسی طرح سے آتا رہا جاتا رہا اور باقاعدگی سے رضیہ کو پیسے دیتا رہا۔ لیکن اس دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا.... عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ کھانا پینا بھی تو ہوتا ہے۔ اکٹھے مل بیٹھنا بھی تو ہوتا ہے۔ بااعتبازی بھی تو ایک چیز ہے۔ صبح کے بھولے کا شام کو گھر آ جانا بھی تو خوشی عطا کرتا ہے۔ خیال کی گائیکی کے بعد ترانہ بھی تو لطف دیتا ہے۔ اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر پان لینا بھی تو ماتھے کو معطر کر دیتا ہے۔ محبوب کے پاؤں میں بیٹھی ہوئی بلی کا اپنے بلونگڑے کو اون کے گولے سے کھیلتے دیکھنا بھی تو سکھ ساگر کا بھید عطا کر دیتا ہے.... اس دنیا میں صرف پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں۔ رضیہ کے ذہن میں یہ خیال میلے کے پرانے پنگھوڑے کی طرح رنگ برنگی آوازیں دیتا گھومتا رہا۔ محبت تو اس کے دل میں بھی باقی نہ رہی تھی، صرف ایک غصہ تھا جو اس کے وجود کی کچی دیوار پھلانگ کر اندر آ گیا تھا اور وہاں کسی کو نہ پا کر بڑھکیں مارنے لگا تھا۔

رضیہ نے حسن خان کے پستول سے تین فائر کر کے صدیق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا اور خود تھانے چلی گئی۔ اس نے اخبار میں کئی مرتبہ یہ پڑھا تھا کہ قتل کرنے کے بعد قاتل خود ہی آلہ قتل لے کر تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس کو صبح سویرے منگورہ کے تھانے چلے جانا اچھا لگا!!

لیکن تھانے دار صاحب کو اپنی مہینہ بھر کی تفتیش سے بھی نہ تو قتل کا محرک ملا اور نہ ہی کوئی ایسی وجہ نظر آئی جس نے رضیہ کو اپنے من پسند شوہر کے قتل پر آمادہ

کر دیا تھا۔ انہوں نے بلاوجہ گل زمان اور حسن خان کو پابند حاضری کر کے شامل تفتیش کیا ہوا تھا۔ پنجاب پولیس کی مدد سے تھانے دار صاحب نے رضیہ کے ماموں اور مامی کو بھی دو مرتبہ حراست میں لے کر منگورہ منگوا بھیجا تھا لیکن اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہو سکا تھا۔

حوالات میں بند رضیہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ ایک ہی بات کہتی تھی کہ پہلے صدیق مجھے پسند تھا، پھر ناپسند ہو گیا۔ ناپسندیدہ چیز کے ساتھ آدمی کب تک اور کس طرح سے زندگی گزار سکتا ہے! میں نے اس کو اپنی راہ سے الگ کر دیا لیکن میں یہ نہیں کہوں گی کہ وہ برا آدمی تھا۔

تھانے دار صاحب نے پشاور سے اپنے استاد ڈی ایس پی کرم داد خان کو بھی بلا کر موقع واردات کا معائنہ کروایا اور رضیہ سے ملاقات کروائی لیکن وہ بھی اس نتیجے پر نہ پہنچ سکے کہ رضیہ کے دل میں اچانک نفرت کے جذبات کیوں پیدا ہو گئے اور اس نے بغیر کسی تحریک کے اتنا بڑا اقدام کس طرح سے کر لیا۔

اصل میں تھانے والوں کے پاس وہ علم ہی نہیں تھا جس کی بنیاد پر رضیہ سے یہ فعل سرزد ہوا تھا۔ نہ رضیہ کے ماما اور مامی کو اس بات کا پتہ تھا۔ نہ ہی بے چارے گل زمان اور حسن خان کو یہ اندازہ تھا کہ رضیہ آگے چل کر یہ فعل کرے گی اور ان کو مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔ خود رضیہ کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جس سینے پر وہ ہاتھ رکھ کر سوتی رہی ہے، اس پر گولیاں چلا دے گی۔

جس روز پہلی مرتبہ رضیہ سلور کا کٹورہ لے کر صدیق کی ریڑھی پر دہی بھلے لینے آئی تھی تو اس کو صدیق میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، لیکن جب اس نے اپنا کٹورہ صدیق کی طرف بڑھا کر کہا "دو روپے کے بھلے اور پچاس پیسے کا کھلا چاٹ مسالہ" تو اسے ہلکی سی کھانسی آ گئی۔ رضیہ کھانسی تو اس کی پھوار کا ایک ابخرہ صدیق کی مونچھوں کے اندر گھس گیا۔ اس ابخرے میں پرانی برنکائٹس کے جراثیم تھے جو اس کی مونچھوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے سانس کے راستے صدیق کے پھیپھڑوں میں پہنچ گئے۔ وہاں پہلے سے تپ دق کے Mycobteaerium Tuberculosis جراثیم موجود تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے گھل مل گئے اور جب رضیہ کے نیو موکوکس جراثیموں

نے صدیق کے پھیپھڑوں کو اپنے لیے ایک صحت افزا مقام پایا تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ دیکھتے دیکھتے ہزاروں لاکھوں کی کثرت میں تبدیل ہوگئے۔ تپ دق کے جراثیموں نے ان کے لیے اپنی پرانی بستیاں خالی کر دیں اور ان کے درمیان اور کئی قسم کے متعلقہ بیماریاں پیدا کرنے والے مائیکرو آر گینزم پیدا ہوگئے۔ جس روز رضیہ نے داتا دربار سے مکھانے کی نیاز لے کر صدیق کو دی تھی اور وہ سارے مکھانے چوس کر بہت خوش ہوا تھا تو اسی وقت اس کے اندر پیتھوجینز کی ایک فوج ظفر موج تیار ہوگئی تھی جس میں اس کے پرانے دق کے جراثیموں کے علاوہ رضیہ کے کرانک برنکائٹس کے جرثومے پیرا آرتھرائٹس Ottis media کو بھی انگیخت کر رہے تھے۔

جس روز کریم دفتری کی بیٹی زبیدہ کو ساتھ لے جا کر رضیہ نے دہی بھلوں والا صدیق دکھایا اور واپسی پر اپنی دونوں کلائیاں شام کے دھوئیں میں صدیق کے ماتھے اور ہونٹوں کے حوالے کر دیں تو رضیہ کے بہت سارے پرانے جراثیم اپنے نئے دوستوں اور نئے ہم مشرب جراثیموں کو ساتھ لے کر واپس رضیہ کے ذخیرے اور سانس کی نالی میں آ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ آنے والے مہمانوں کی جی بھر کے خدمت کی اور انہیں رضیہ کے سارے بدن کی سیر کرائی۔ خون میں، گوشت میں، لنف میٹر میں، رگ و پے میں.... ہر مقام اور ہر جگہ انہیں بسایا اور ان کی تازہ بستیاں آباد کیں۔ جراثیموں کی آپس کی محبت اور بے لوث اور پرخلوص تعلق اور کہیں کہیں گوت مختلف ہونے کے باوجود مگر ایک ہی ذات کے ہونے کی وجہ سے ان کی آپس کی رشتہ داریاں ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوئیں کہ رضیہ اور صدیق کے بدن ان کے لیے میکے اور سسرال بن گئے، اور وہ اپنے اپنے میکے لیے تڑپنے پھڑکنے لگے۔

اس تڑپ نے اور پھڑک نے رضیہ اور صدیق کو زیادہ دیر تک الگ الگ نہیں رہنے دیا اور وہ ایک صبح پشاور سے آنے والی لیٹ گاڑی پکڑ کر ساہیوال پہنچ گئے اور ایک دوسرے کی گردنوں کے ساتھ منہ گھسیڑ گھسوڑ کے سونے لگے۔ سانس کی گزر گاہیں ذرا دیر کے لیے بھی ایک دوسری سے دور ہوتیں تو آنے جانے والے جراثیم اپنے راستوں میں دوری دیکھ کر دونوں کے بدنوں میں ہنگامہ کھڑا کر دیتے اور ہر رگ و ریشہ کے اندر احتجاجی جلسے جلوس شروع ہو جاتے۔ کچھ صحت مند نوجوان اور

بیکٹیریالوجی کے علم سے آشنا جراثیم فوٹوجینز اکٹھے کرکے شریانوں کے ہر چوراہے پر ان کے ٹائر جلانے لگتے۔ رضیہ اور صدیق گھبرا کر پھر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے اور جراثیموں کے درمیان آنے جانے کا آزاد سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ دراصل دو بدنوں کے اندر رہنے والے کرانک جراثیموں کے درمیان محبت اور یگانگت کا ایسا اٹوٹ رشتہ پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے رضیہ اور صدیق ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکتے تھے۔ ان کے درمیان محبت کی مضبوط ڈوری اور عشق کا سچا رشتہ بس یہی جراثیم تھے جو ارتباط باہمی کی بدولت ایک دوسرے کے ہم حال ہوگئے تھے۔ جس طرح مغلوں اور راجپوتوں کے درمیان پیار محبت کا تو کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی ہم حالی اور ہم خیالی کا کوئی تعلق تھا لیکن نظریہ ضرورت کے تحت وہ ایک دوسرے سے ایسے شیر و شکر ہوگئے تھے کہ ان کی اولادیں تک مشترک ہو گئی تھیں اسی طرح دق اور مزمن برنکائٹس کے جراثیموں نے آپس میں گھل مل کر دونوں بدنوں میں ایک جیسی بستیاں بسالی تھیں اور انہوں نے ہر طرح کے اختلافات کو بھلا کر باہمی اتفاق کو نشان منزل بنا لیا تھا اور یہ انہی کی یگانگت اور موافقت تھی جس نے رضیہ اور صدیق کو سارس کے جوڑے سماں ایک دوسرے کے شانتی سروپ پنکھ بنا دیا تھا۔

لیکن ظالم زمانہ کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ جب رضیہ اور صدیق کو سوات میں تین مہینے سے اوپر کا عرصہ بیت گیا تو صحت افزا مقام کی ہواؤں نے اور کونی فر قسم کے درختوں کے آکسیجن بردار سانسوں نے مل کر رضیہ اور صدیق کے جسموں کے درمیان تیز دھار تلوار رکھ دی۔ پہاڑ کی فضا نے اور منگورہ سینی ٹوریم جیسے ماحول نے صدیق کے پھیپھڑوں میں دق کے جراثیموں کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ان کی اٹھارہ انیس سالہ پرانی ہستی بستی بستیاں اجڑنے لگیں اور جراثیموں کے گھرانوں کے گھرانے تباہ و برباد ہونے لگے۔ ان تاخت و تاراج ہونے والی سلطنتوں میں پھیپھڑوں کے لذیذ ماحول کے آس پاس ان نئے آباد کار جراثیموں کی آبادیاں بھی تھیں جو رضیہ کے بدن سے نکل کر اپنے انصار بھائیوں کی محبت میں صدیق کے اندر آباد ہوگئے تھے۔ لیکن اس بلائے ناگہانی سے گھبرا کر اور صدیق کے بدن میں موت کو ایسا ارزاں دیکھ کر وہ واپس اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت کرنے لگے۔ رضیہ کی کھانسی اور سینے کے درد میں اضافہ ہوگیا تو اس نے درد بھری نگاہوں سے صدیق کی طرف دیکھا۔ جوں

جوں وہ صدیق کی طرف بڑھتی، اس کے اپنے سالہا سال پرانے جرثومے اس پیش قدمی کے خلاف پوری طاقت استعمال کرتے اور اندر ہی اندر بغاوت کرکے رضیہ کا من پھیر دیتے۔

ادھر صدیق کے سسٹم میں ایک ایسا جراثیم کش مادہ بننے لگا تھا جس نے اپنے اردگرد کے سارے ماحول پر اک germicide دھند کا تنبو تان دیا تھا۔ رضیہ کے اندر کا کوئی شوخ و چنچل جرثومہ جب پرانی چترائی میں ڈوبا ہوا صدیق کے بدن کے پاس پہنچتا تو جسم میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ بھسم ہو جاتا۔

اور یہ صرف صدیق ہی کے جسم کا قصور تھا جس میں اچانک ایسی تبدیلی پیدا ہو جانے سے رضیہ کا بدن اس کا دشمن بن گیا تھا۔ وہ Bacterial Synergism جو بیکٹیریا کے مختلف خاندانوں کے درمیان بڑی سرعت کے ساتھ پیدا ہو رہی تھی اور جس نے دونوں بدنوں کے اندر اپنے ردعمل سے بھائی بندی اور خویش پروری کی مدھ بھری مدہوشی پیدا کر رکھی تھی وہ صدیق کے بدن کی غداری اور سرکشی سے بیکٹیریا کشی کا قبرستان بن گیا۔

جب بدن کے اندر جراثیموں میں ہی دوسرے بدن کے جراثیموں اور بیکٹیریوں کا احترام نہ رہا اور ان کے درمیان آمدورفت اور آت جات نہ رہی تو پھر جسموں نے خاک ایک دوسرے سے لپٹنا اور ہم بغل ہونا ہے۔ گلے لگنے کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں اور ساتھ رہنے کے پس پردہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ جب کوئی باعث نہ رہا، کوئی موجب نہ رہا تو پھر کیسی یاری اور کیسی سنگت!

اب رضیہ اور صدیق کے بدنوں کے درمیان وہ پہلے والی گہما گہمیاں، آوا جادیاں، ہنگامہ خیزیاں اور ریشہ دوانیاں باقی نہیں رہی تھیں۔ بیمار محبت کے مریض کچے دھاگوں کو پہاڑوں، دریاؤں، چشموں اور ندی نالوں کی صحت افزا ہواؤں نے کاٹ کے رکھ دیا تھا اور دو محبت کرنے والے بدنوں کے درمیان قدر مشترک کا ایک بھی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔

اس ظلم، بے وفائی، ناقدری، حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف تین فائر ہوئے اور بے بس اور بے اختیار رضیہ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔

بولتا بندر

مجھے سن اور مہینہ تو یاد نہیں البتہ یہ اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اور ساری کلڈنہ روڈ دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ موسم کی گرمی کو کچھ پہاڑ کی اوٹ نے، کچھ چیڑھ کے گرانڈیل درختوں نے اور کچھ درختوں کے تنوں پر اگتی ہوئی اور جمتی ہوئی کائی نے اور بہت کچھ اس دھند نے کاٹ کر اور چاٹ کر خورسند و خوش گوار کر دیا تھا۔

آج دفتر بند تھا۔ چھٹی کا دن، فرصت کا سماں اور لمبی سیر کا موڈ تھا۔ ہم ہلکے ہلکے گرم کپڑے پہنے اپنی اپنی چھڑی گھماتے دھند آلود تنفس سے لطف اندوز ہوتے جیمکا گلی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یوسف ظفر اور میں اونچے گلے والے سوئٹر پہنے تھے جبکہ مختار صدیقی گرے فلینل سوٹ میں ملبوس تھا۔ استاد اپنی اس طویل نظم کے بند سنا رہا تھا جو ابھی پچھلی رات اس پر وارد ہوئی تھی اور منشی مختار صدیقی لن یو تانگ کی اس کتاب کے پیرے سنا رہا تھا جو وہ زبانی ترجمہ کر کے مبشر کو لکھوایا کرتا تھا۔ دونوں اپنے اپنے فن میں بہت اونچے جا رہے تھے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس وقت میں کچھ زیادہ معتبر نہیں ہوا تھا البتہ میرا طبلہ بجنے ضرور لگا تھا اور اس کی بڑھت میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ محمود نظامی کو یقین تھا کہ بہت جلد میں بھی اپنے سینئر ساتھیوں کے ساتھ اسی طرح بھاگنے لگوں گا جس طرح گدھا گاڑی کے ساتھ زیر تربیت چھوٹا گدھا بھاگا کرتا ہے۔

جب ہم شریفانہ اٹھکیلیاں کرتے اور ایک دوسرے پر مہذب آوازے کستے سڑک کے آخر پر دائیں گھومنے لگے تو استاد یوسف ظفر نے کہا "کیوں نہ دائیں کے

جائے بائیں گھوم جائیں اور خراماں خراماں اس سڑک پر اتر جائیں جو باڑیاں جاتی ہے!"

"باڑیاں!" مختار صدیقی نے حیرانی سے کہا "پیدل؟"

"جی ہاں پیدل" استاد یوسف ظفر نے جواب دیا "آن فٹ"

"بغیر چھتریوں کے؟" منشی مختار صدیقی نے کہا۔

"جی ہاں بغیر چھاتے کے۔" استاد ظفر نے چھتری کی تانیث کو چھاتے میں بدل دیا تو مختار صدیقی نے کہا "اتنی دور جانے کا فائدہ؟"

میں نے کہا "منشی! چھٹی کا دن ہے، موسم خوش گوار ہے ——"

"جیا بے قرار ہے" استاد نے میری بات کاٹ کر کہا "چھٹی کا تیسار ہے۔ بلم کی پکار ہے۔ جھپتی جھپتی آ جا مانو!!"

مختار صدیقی نے اپنی چھتری پر ہلکے سے بدن کا بوجھ ڈال کر کہا "دیکھ لو بھئی اور اچھی طرح سوچ لو، اگر بارش شروع ہو گئی تو راستے میں کوئی شیلٹر نہیں ملے گا۔"

استاد نے کہا "کوئی پروا نہیں، نہ ہم بدلتے موسموں سے ڈرتے ہیں نہ شیلٹروں کی دریوزہ گری کرتے ہیں۔ آندھی ہو یا بارش، طوفان ہو یا ابر سیہ مست —— ہم اپنی راہوں میں خود چراغاں کرتے ہیں اور اپنے دیے آپ جلاتے ہیں۔"

منشی مختار صدیقی کے منہ سے احتجاج کے باوجود ہم باڑیاں والی سڑک پر گھوم گئے۔ چند قدم آگے جا کر بڑے پتھروں کے پاس جب بارش کی موٹی موٹی بوندوں نے ہمارا سواگت کیا تو مختار صدیقی نے کہا "میں نے کیا بکواس کی تھی!"

یوسف ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا "آپ نے بالکل ٹھیک بکواس کی تھی۔ اب آگے چلیے۔ وہ سامنے کچھ بزرگ قسم کی بوندیں بار لے کر ہمارا انتظار کر رہی ہیں، ان کا دل توڑنا مناسب نہیں —— تشریف لے چلیے۔"

لیکن جب ہم ان بڑی بوندوں کے محاذ میں گئے تو وہ ہم پر برسی نہیں، ویسے ہی فضا میں لٹکتی رہیں۔ آگے موسم کچھ بہتر ہو گیا تھا لیکن دھند کی دبازت بڑھ گئی تھی۔ یوسف ظفر نے کہا "مزے مزے سے چلتے ہوئے ہم ٹھیک ساڑھے بارہ بجے باڑیاں پہنچ جائیں گے۔ انڈے مکھن کھانا کھانے، چائے پینے اور سگریٹ پھونکنے کے بعد ہم پورے

دو بجے یہاں سے چل دیں گے اور شام سے بہت پہلے واپس ہوٹل پہنچ جائیں گے۔"

اس وقت مری کے اس شارٹ ویو ریڈیو سٹیشن پر ہم چار قلم کار کام کرتے تھے۔ میں ان سب میں جونیئر تھا اور ممتاز مفتی ہم سب سے سینئر سکرپٹ رائٹر تھا۔ وہ چونکہ ہفتے کے روز چھٹی کرتا تھا اس لیے آج اتوار کے دن وہ اپنی ٹرانسمشن فیڈ کر رہا تھا اور ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر اس کے بغیر ادھورا تھا اور اس لمبے سفر پر ادھورا ہی چلا جا رہا تھا۔ اگر کہیں ہمارے درمیان مختار صدیقی کے وسیع مطالعے کا سہارا نہ ہوتا تو ہم اپنے ہوٹل کے گرد تالابوں کا چکر لگا کر واپس کمرے میں پہنچ چکے ہوتے لیکن مختار صدیقی بتا رہا تھا کہ..... کوہ مری گزٹیئر میں لکھا ہے کہ 1880ء میں باڑیاں کے گرد گیدڑوں کی تعداد میں ایسا اضافہ ہوگیا کہ یہاں کی انسانی آبادی کو ان سے خطرہ لاحق ہوگیا۔ گیدڑ رات کے وقت راجوں کی فصلیں تباہ کرنے میں مصروف رہتے اور دن کو ان کے بے کواڑ گھروں میں گھس کپڑے ٹوکروں سے ان کی مرغیاں نکال کر لے جاتے۔

کرنل مارک لکھتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ بڑے محنتی، کارکش اور بہادر تھے مگر گیدڑوں سے ڈرنے لگے تھے۔ اگر کسی مخلوق کی آبادی اس کی ہم آباد مخلوق سے کثیر ہو جائے تو دوسری مخلوق کتنی بھی بہادر کیوں نہ ہو، کثیر آبادی والی مخلوق کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔

گورنر پنجاب نے راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر کو حکم بھیجا کہ ایریا ہیڈکوارٹر سے لال کرتی پلٹن کے عمدہ نشانچی منتخب کرکے انہیں باڑیاں روانہ کر دیا جائے۔ وہ ٹکڑی گولی بارود کا حساب رکھے بغیر اندھادھند گیدڑوں کو نشانہ بنائے اور ایک مہینے کے اندر اندر گیدڑوں کی نفری میں کمی کی رپورٹ ڈپٹی کمشنر کے ذریعے گورنر صاحب کو روانہ کرے اور ساتھ ہی اگلے مہینوں کا تخمینہ تیار کر کے بتائے کہ کتنے اسلحے اور کتنے جوانوں کی مزید ضرورت ہے۔

منشی نے بتایا کہ رپورٹ کے مطابق پورے چھ مہینے اس علاقے میں گیدڑوں کی چاند ماری ہوتی رہی لیکن ان کی تعداد میں کماحقہ کمی واقع نہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ کرنل مارک کی بیوی لیڈی مارک جانوروں سے بے انتہا محبت کرتی تھیں اور لندن کی

انجمن انسداد بے رحمی کی بہت پرانی کارکن تھیں۔ ان کو جب پہلے ہی دن گیدڑوں کے قتل عام کا علم ہوا تو انہوں نے ساری پلٹن کو اپنے بنگلے پر بلوا کر حکم دیا کہ خبردار جو تم نے ایک گیدڑ بھی مارا یا زخمی کیا۔ یہ خداوند پاک کی مخلوق ہے اور بالکل ہماری تمہاری طرح سے زندگی بسر کرتی ہے۔ تم ان کو مارو گے تو دوزخ میں جاؤ گے اور ساری عمر آگ میں جلو گے۔

سپاہی لیڈی صاحبہ کی یہ بات سن کر سکتے میں آ گئے اور پریشان ہو کر پوچھنے لگے کہ اگر کیپٹن صاحب نے ان سے پوچھا کہ ایمونیشن کیوں ختم نہیں ہوا تو وہ کیا جواب دیں گے۔

لیڈی مارک نے کہا "تم اوپر نیچے، دائیں بائیں ہوا میں گولیاں چلاتے رہا کرو اور اونچے اونچے للکارتے رہا کرو، تمہارا ایمونیشن خود ہی ختم ہوتا رہے گا۔ پھر میں کیپٹن کو بھی بنگلے پر بلوا کر صاحب سے حکم کروا دوں گی، وہ تم کو نہیں پوچھے گا۔"

یہ کہہ کر لیڈی صاحبہ نے ہر سپاہی کو چاندی کے دو دو روپے نذرانے کے طور پر دیے اور یوں مری کے علاقے میں پہلی مرتبہ رشوت کی بنا پڑی۔

جب میں نے مختار صدیقی سے ایسی بھرپور تفصیلات کے مآخذ اور مصادر کی بابت پوچھا تو اس نے جھڑک کر کہا "یہ چیزیں گہرے اور مسلسل مطالعے کے بعد حاصل ہوتی ہیں.... ایسے نہیں، تم لوگوں کی طرح سے کہ پھٹی جیب میں ڈیڑھ روپے کا فاؤنٹین پن لگا کر سکرپٹ رائٹری کرنے نکل پڑے۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔"

یوسف ظفر نے کہا "گزٹیئر کے عمیق مطالعے سے ہندوستان کا سارا ماضی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے.... اپنی ایک ایک تفصیل اور ٹھیک ٹھیک شرح اور کیفیت کے ساتھ۔ لیکن تم لوگوں نے گزٹیئر کو بس ایسے ہی سرسری طور پر دیکھ کر چھوڑ دیا ہوگا۔"

میں نے سول ملٹری گزٹ تو کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن گزٹیئر کا نام پہلی مرتبہ سنا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔

مختار صدیقی نے کہا "جب ایک طویل مدت گزرنے کے بعد بھی گیدڑوں کی تعداد میں کمی نہ ہوئی اور کسانوں کا ایک وفد ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کی خدمت میں حاضر

ہو کر عرض گزار ہوا تو اوپر نیچے ہلچل مچ گئی۔ کرنل مارک نے آ کر اپنی بیوی سے شکایت کی کہ اس کی حیوان دوستی کے قصے اب دور دور تک پہنچ گئے ہیں اور وہ وقت بہت قریب آ گیا ہے جب کرنل صاحب کو سرکاری طور پر طلب کر کے ان سے محکمانہ طور پر استفسار کیا جائے گا کہ گیدڑ تلفی میں ان کی بیگم ایک رخنہ بن کر گیدڑوں کی آبادی میں اضافہ کا موجب بن رہی ہیں تو میں کیا جواب دوں گا۔

اس پر لیڈی مارک نے کہا "تم خاطر جمع رکھو، میں نے گیدڑوں کی آبادی کم کرنے کی ایک رحم دلانہ ترکیب سوچ لی ہے۔ نہ ان کی جانوں پر عذاب آئے گا نہ تمہاری جواب طلبی ہوگی۔ سب معاملہ خیریت سے طے ہو جائے گا۔"

یوسف ظفر اور میں اس قصے کو بڑے غور سے اور نہایت دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے اور مختار صدیقی کے سوا ہم دونوں ہی لیڈی مارک سے قطعی طور پر ناآشنا تھے حالانکہ استاد یوسف ظفر گزٹیئر وغیرہ پڑھتا رہتا تھا۔

"اگلے ہی روز" مختار صدیقی نے کہنا شروع کیا "لیڈی مارک نے خیرا گلی سے کیپٹن ڈیوڈ کو بلوا بھیجا۔ کیپٹن ڈیوڈ خیرا گلی کی فچرکور کا وٹرنری ڈاکٹر تھا اور تازہ تازہ لیورپول سے آیا تھا۔

لیڈی مارک نے کیپٹن ڈیوڈ کو اپنی سکیم بتائی تو وہ سوچ میں ڈوب گیا اور پھر سر اٹھا کر بولا "ہم نے یہ علم کتابوں میں تو نہیں پڑھا لیکن چونکہ آپ فرماتی ہیں تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔ پھر آپ ایک کرنل کی وائف ہیں اور برٹش آرمی میں ہر آرمی آفیسر رائٹ ہوتا ہے اور ہر آرمی آفیسر کی بیوی رائٹ ہوتی ہے۔ اس لیے میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا، اور جلد کروں گا۔"

"چنانچہ" منشی مختار صدیقی نے سر ہلا کر کہا "کیپٹن ڈیوڈ کو سرکاری طور پر خیرا گلی سے باڑیاں شفٹ کر لیا گیا اور اس نے گیدڑوں کی فیملی پلاننگ شروع کر دی۔"

میں نے استاد کی طرف اور استاد نے میری طرف غور سے دیکھا۔ منشی نے کہا "رات کو شیرے کے پرانے کنستروں کے پاس تانت کے کمانچے والے پھندے لگا کر گیدڑوں کو پکڑ لیا جاتا۔ سامنے تیز الاؤ کی روشنی میں لے جا کر گیدڑنیوں کو تو چھوڑ دیا جاتا مگر گیدڑوں کو جھپاک سے لٹا کر انہیں آختہ کر کے ان کی نسل بندی کر دی جاتی۔

پھر تین گھنٹے کا ریسٹ دینے کے بعد ان گیدڑوں کو بھی چھوڑ دیا جاتا۔"

میں نے کہا "منشی! یہ سب باتیں گزٹیئروں میں لکھی ہیں؟"

"خالی گزٹیئروں سے ہی سب کچھ نہیں مل جاتا" اس نے جھڑک کر کہا "اس کے لیے اور بہت سا مطالعہ بھی کرنا پڑتا ہے۔"

استاد یوسف ظفر نے کہا "پھر کیا ہوا؟" تو منشی نے کہا "ہونا کیا تھا، تین مہینے کی قلیل مدت میں سب گیدڑ نس بند ہو گئے اور ان کی آبادی میں تیزی سے کمی ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے نئے بچے پیدا ہونا بند ہو گئے اور بڑے گیدڑ اور گیدڑنیاں فوت ہوگئیں۔ کسانوں نے اس خوشی میں قرب و جوار کے سارے پہاڑوں پر میلے منعقد کیے جو جمعرات سے شروع ہو کر اگلی جمعرات تک جاری رہے۔ لیڈی مارک کو لندن، برمنگھم، برسٹل، گلاسگو، ایڈنبرا، سرے اور مانچسٹر سے حیوان دوست انجمنوں نے سات شیلڈیں بھجوائیں اور گیدڑ تلفی کی مزاحمت میں سر دھڑ کی بازی لگانے پر ان کا نام نوبل پرائز برائے امن کے لیے روانہ کیا۔"

میں نے کہا "پھر؟"

منشی مختار صدیقی نے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا "اوئے موٹے آدمی! کچھ نتیجہ اپنے بھیجے سے بھی تو نکال لیا کرو۔"

"میرا بھیجا ایسا قابل اعتماد نہیں ناں" میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

منشی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اقتصادیات کے پروفیسر کا چہرہ بنا کر کہا "تاریخ کی پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ برصغیر کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جہاں خاندانی منصوبہ بندی کا اس قدر کامیاب تجربہ کیا گیا۔"

ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ بارش کے ایک ریلے نے ہمیں دونوں طرف سے گھیر لیا۔ نہ آگے جانے کی راہ رہی نہ پیچھے پلٹنے کا راستہ۔ مختار صدیقی نے قدرے غصے سے کہا "اب بتاؤ احمقو، تم سے کس نے اس راستے پر آنے کے لیے بولا تھا؟"

یوسف ظفر نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا "ادھر آجاؤ منشی، ادھر۔ یہ علاقہ بوچھاڑ

سے باہر ہے۔"

واقعی وہاں ایک تنگ سے پہاڑی راستے کا درہ تھا جہاں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یہ راستہ اچھا کھلا سا جیپ ٹریک تھا لیکن ذرا سا آگے جا کر اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ اس میں سے ایک موٹا آدمی بمشکل تمام گزر سکتا تھا۔ اس کے بعد کا اندھیرا بتاتا تھا کہ آگے کوئی جگہ نہیں کہ یہاں سے نشستہ پہاڑ کی پیٹھ شروع ہو گئی ہے۔

جیپ ٹریک بھی آگے بارہ دری جیسے ایک صحن میں کھل کر پھر اپنے سائز کا ہو کر آگے کو نکل جاتا تھا۔ اس محفوظ صحن میں ترائی کے ایک چھوٹے سے جنگل کی سی کیفیت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نہ کوئی اس جنگلیا میں پہلے کبھی داخل ہوا اور نہ آئندہ اس کی امید تھی۔ ہم تینوں ان مانے ڈرپوک سیاح اس میں بہ امر مجبوری داخل ہو گئے تھے اور جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان کھڑے سوچ رہے تھے کہ آگے جا کر پھر لوٹیں یا ابھی سے لوٹ جائیں کیونکہ لوٹنا تو ہر حال میں تھا کہ آگے جانے والا راستہ اندھیرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

یہ صحن نما گھیراؤ تقریباً پینتیس لاکھ سال پرانا تھا اور یہاں کسی زمانے میں کوئی عبادت کدہ رہ چکا تھا۔ اس کے اندر موٹے تنے کے چھوٹے قد کے درخت تھے اور پتھروں سے ایسی بیلیں برآمد تھیں جن کے پتے گلو کی بیلوں جیسے تھے اور جن پر کیسری رنگ کے پھول مدھری جسامت کے تھے۔ اس بڑے سائز کی کھو کے ایک کونے میں نئی پرانی بیلوں کی بھرمار تھی اور اس بھرمار کے نیچے کچھ زندگی کے سے آثار نمایاں تھے۔

استاد یوسف ظفر نے کہا "آگے چلو، یہ راستہ ہم کو پہاڑ کی جھری میں سے نکال کر بیک پر لے آئے گا اور کسی پہاڑی پگڈنڈی پر ڈال کر پھر بڑی سڑک سے ملا دے گا۔"

پیشتر اس کے کہ ہم میں سے کوئی جواب دیتا، نئی پرانی بیلوں کی بھرمار کے اندر سے آواز آئی "محترم آگے کوئی راستہ نہیں۔ آگے صرف ایک طویل گپھا ہے جس سے کوئی پگڈنڈی نہیں نکلتی۔ یہ اندھی گپھا صدیوں سے اسی طرح بند ہے اور اس کے اندر کچھ اور قسم کی مخلوق آباد ہے۔"

ہم نے خوف اور تحیر کے ملے جلے جذبات سے بیلوں کے اندر نظر دوڑا کر

دیکھا تو ہمیں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ کچھ عجیب اندھیرے اجالے کا سا سماں تھا۔ بیلوں کے چھپر تلے ایک اور چھجا سا بن کر جھکا ہوا تھا۔ صدیوں کی گروتھ سے موٹے موٹے تھن متھنے ڈنٹھلوں کے رسے سے بٹے پڑے تھے: کچھ نیچے کچھ پہاڑ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ، کچھ موٹے ٹھگنے درختوں کی کمر میں کچھ ان کی ٹہنیوں میں اور کچھ جھولوں کے انداز میں جن کی گولائیاں تو تھیں لیکن ان کے سرے کدھر بندھے تھے، یہ نظر نہیں آتا تھا۔

"چمپنزی! چمپنزی!" یوسف نے اپنی موٹی موٹی چمک دار آنکھیں عینک کے روشن روشن شیشوں کے پیچھے گھما کر ہانک لگائی "چمپنزی!"

"کدھر؟ کدھر؟" ہم نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"وہ دیکھو — وہ" یوسف ظفر نے ایک محقق زوآلوجسٹ کی طرح کہا "وہ سامنے، نئی پرانی بیلوں کے ٹیڑھے چھپر تلے — وہ۔"

جب یوسف ظفر نے ایک چنچل بچے کی طرح "وہ وہ" کہتے ہوئے اس کی طرف پے در پے اشارے کئے تو اس نے آزردہ ہو کر کہا "میں چمپنزی نہیں، ایک سادہ بندر ہوں — عام بھورا بندر۔"

اس کی یہ بات سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ کچھ خوف، کچھ حیرانی، بہت ساری بے یقینی — اس کے ساتھ ساتھ جانور کی انسانی گفتار کا رعب۔ ہم تینوں پتھر کے بت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

پھر اس نے تھوڑا سا کراہتے ہوئے، قدرے دھیمی آواز میں کہا "صاحبو! کیا کروں، بیمار ہوں۔ بیمار نہ ہوتا تو بھی آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکتا۔ میری عمر میں پہنچ کر ہر کوئی لاچار ہو جاتا ہے۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

مختار صدیقی نے کہا "ہم مری سے حاضر ہوئے ہیں اور سرکاری ملازم ہونے کے ناتے آج کل مری ہی کے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں۔"

یوسف ظفر نے یہ سوچ کر کہ میں کیوں پیچھے رہوں، جلدی سے کہا "آج چھٹی کا دن تھا۔ ہم گھومتے گھماتے ادھر آ نکلے تو راستے میں بارش نے پکڑ لیا — دراصل ہم دوپہر کا کھانا کھانے باڑیاں جا رہے تھے۔"

بندر بولا "باڑیاں میں زیادہ تر بیف بھون کر مٹن کے نام سے فروخت کرتے ہیں۔ اگر آپ سوار گلی چلے جائیں تو وہاں صرف ایک ہی دکان ہے جس کا بھنا ہوا گوشت اس سارے علاقے میں مشہور ہے۔ اس کا کھانا آپ کے لیے مناسب رہے گا۔"

میں نے کہا "آپ کو کس نے بتایا کہ وہاں کا کھانا سب سے عمدہ ہے؟"

بندر نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے بے زاری سے کہا "او بھائی بتانا کس نے تھا، میں نے خود کئی مرتبہ کھایا ہے وہ کھانا۔ جب ہمارے لڑکے بالے ادھر ہوتے تھے تو کئی مرتبہ پکی پکائی ہنڈیا چولہے سے اتار کر لے آتے تھے۔ ہم خود بھی کھاتے تھے اور اڑوس پڑوس بھی بھجوا دیتے تھے۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔"

میں تو بندر صاحب کے اس سوشل آرڈر کی تبدیلی پر دل برداشتہ تھا کہ ہر فقرہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولتے تھے لیکن میرے ساتھی ایک اور حیرت میں گم تھے۔ مختار صدیقی نے اپنے نستعلیق لہجے میں پوچھا "آپ اردو بہت اچھی بولتے ہیں، شین قاف سے درست — یہ آپ نے کہاں سے سیکھی؟" لیکن پیشتر اس کے کہ بندر اس کا جواب دیتا، یوسف ظفر نے بے صبری سے پوچھا "کیا آپ کبھی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب سے ملے ہیں؟"

بندر نے بڑی شرافت سے سر جھکا کر کہا "مجھے اُن کی خدمت میں حاضری دینے کا اتفاق تو نہیں ہوا البتہ میں اور بہت سے مشاہیر سے ضرور ملا ہوں — لیکن پیشتر اس کے کہ ہماری گفتگو طول پکڑ جائے، آپ اس پتھر پر تشریف رکھئے اور اس سخت نشست کو بھی زانوے جان تمنا خیال فرمایئے۔ کیا کریں، مجبوری ہے۔ یہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔" پھر وہ ذرا رکا اور اپنے نیچے سے کسی بوٹی کا پتہ نکال کر چباتے ہوئے بولا "آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔"

یوسف ظفر نے کہا "یہ مختار صدیقی ہیں جنہیں ہم پیار سے منشی مختار صدیقی کہتے ہیں۔ یہ اشفاق صاحب ہیں اور آپ کا یہ خادم یوسف ظفر کہلاتا ہے۔"

بندر نے بڑی خوش دلی سے کہا "یوسف ظفر اور مختار صدیقی صاحبان کو تو ہم بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں لیکن ان صاحب سے ہم اس قدر مانوس نہیں ہیں۔ پھر